

خبر و قدر کے درمیان انسانی راہ عمل

— از جناب نعیم صدیقی صاحب —

— (۲) —

پہلی قسط اُس جواب پر مشتمل تھی جو میں نے ایک صاحب کے سوال پر لکھا تھا۔ اب چونکہ یہ تحریر ترجمان القرآن میں شائع کی جا رہی ہے، اس لیے مزید دو ایک نکات کا اضافہ کر رہا ہوں جنہیں مسئلہ کو سمجھنے کے لیے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

۱) خدا نے اپنے علم پیشین اور علم بعد از وقوع اعمال و حادثات میں خود ہی فرق کیا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے ارشادات آتے ہیں کہ **وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَ لِيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ**۔ (اور تاکہ اللہ تم میں ایسے لوگوں کو جان لے۔ یاد رکھ لے۔ جو جہاد کرنے والے ہیں، اور جو صبر کرنے والے ہیں)۔ یا مثلاً یہ ارشاد کہ **لِيَسْمُرَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ** (اللہ خبیث عنصر کو طیب عنصر سے الگ چھانٹ دے) یا **فَنَنْظُرْ كَمْ كَيْفَ تَعْمَلُونَ** (وہ تمہیں دیکھے کہ تم عملاً کیا روٹیہ اختیار کرتے ہو)۔ ان آیات کو سامنے رکھیں تو پوری بات نہ سمجھنے والے قاری کو الجھن ہوگی کہ آخر اللہ تعالیٰ جب غیب دان اور عالم احوال و دوش و فردا ہے تو پھر اُسے دیکھنے، جاننے اور اہل خیر و شر کے چھنٹ کر الگ ہو جانے کا انتظار کیوں ہے؟

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم پیشین کی بنیاد پر کوئی حکم اور کوئی جزا و سزا انسان کے اُن اعمال پر وارد نہیں کرتا جو انسان اپنے محدود دائرہ اختیار میں کرتا ہے، بلکہ وہ اس کی نیتوں، ارادوں، جذبات، خواہشات، افکار، منصوبوں اور اخلاقی اصولوں کے ظہور اور پیرا یہ عمل میں ان کے رونا ہونے کے بعد اپنے قوانین و نواہی کے تحت دنیا و آخرت کے لیے فیصلے صادر کرتا ہے۔

گویا انسانی ذمہ داری کے دائرے میں اعمال کے وقوع پذیر ہونے کے بعد کے علم پر احکام اور فیصلے صادر

ہوتے ہیں را اگر چہ خدا کے علم پیش اور علم بعد از صدور اعمال و واقعات میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ جزا و سزا کا اجرا اور اقوام و مل کے عروج و زوال کے فیصلے علم بعد از وقوع اعمال و واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔

عدالتِ آخرت میں بھی کوئی فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے علم پیش کی بنیاد پر صادر نہیں فرمائے گا، بلکہ محض اپنے ذاتی علم بعد از وقوع اعمال و واقعات پر بھی نہیں۔ وہاں تو ہر معاملے کا باقاعدہ تحریری ریکارڈ سامنے لایا جائے گا، اُس کی بنا پر مقدمات قائم ہونگے، سوالات کیے جائیں گے، انسان کے سامنے اس کے زندگی بھر کے کردار کے متعلق خارجی اور داخلی شہادتیں لائی جائیں گی، اس کے سینے کے مخفی اسرار، اس کے قلب کے پوشیدہ عزائم، اور اس کے ذہن کی تہ در تہ کیفیتیں ساری اس کے سامنے فاش کر کے رکھ دی جائیں گی۔ اُس دن آدمی اپنے آپ کو پوری طرح جانے گا کہ وہ کیا تھا اور کن پر عمل میں اس نے اپنے آپ کو دوسروں سے چھپائے رکھا، اور کن خود فریبیوں سے اپنی حقیقت سے خود بھی آنکھیں چرائیں۔

عدالتِ آخرت کے سارے مقدمات علم بعد از وقوع افعال اور پھر ان اعمال کی شہادتوں کے ریکارڈ پر مبنی ہوں گے۔

(۲) تمام موجودات کی طرح انسانی افراد اور اقوام اور حکومتوں اور تحریکوں سب کے لیے خدا کے ہا ایک اجلِ مسّیٰ قرار پاتی ہے۔ اقوام کو اس نامعلوم اجلِ مسّیٰ تک (جو اللہ کے علم میں ہوتی ہے) مہلتِ کارِ یا رخصتِ عمل دی جاتی ہے اور اسے اقتدار یا ترقی کا موقع عطا کیا جاتا ہے۔ افراد کے لیے یہ مہلت زیادہ سے زیادہ طبعی عمر تک ہو سکتی ہے، اور اقوام کے لیے امکانی صورت میں یہ قیامت تک کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن ضروری نہیں کہ افراد یا اقوام لازماً اُس اجلِ مسّیٰ تک ضرور پہنچیں جس کی گنجائش ان کے لیے رکھی گئی ہے۔ بلکہ جس طرح افراد جسمانی صحت کی تباہی کے وجہ و عوامل کے شکار ہو کر وقت سے پہلے اپنا دورِ عمر ختم کر لیتے ہیں، اسی طرح اقوام اپنے غلط اخلاقی رویوں سے اللہ کی عطا کردہ زیادہ سے زیادہ مہلتِ کارِ یا رخصتِ عروج و اقتدار سے استفادہ کرنے سے محروم ہو جاتی ہیں اور ان کے لیے اجلِ مسّیٰ کا جو نشان مستقبل میں دور کسی مقام پر لگا ہوتا ہے، اسے وہاں سے اٹھا کر مثبتِ الہی پیچھے لے آتی ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے میرے سامنے وہ آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اقوام کو راست روی کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ لِيُوَخِّذِكُمْ إِلَىٰ آجَلٍ مُّسَمًّى ذَاكُمُ الَّذِي كُنْتُمْ تُؤْتُونَ مَالَكُمْ بِهِ لَكُمْ فِيهِ حَقٌّ لَكُمْ أَنْ تَقُولُوا مَا كُنْتُمْ تَدْعُونَ (سورہ بقرہ، آیت ۲۱۷)۔ اس موقع کو ضائع

کر دینے والی اقوام کو ایسے عالم میں بیکدم (رُكْبَتَةً) دبوچ لیا جاتا ہے جب کہ وہ اپنی قوت، ترقی اور کامیابی پر جھوم رہی ہوتی ہیں یا عیش و تنعم میں مگن ہوتی ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگر اہل مسمیٰ غلط عملی روش کی وجہ سے پیچھے آسکتی ہے، تو صحیح رویے کی صورت میں وہ آگے بھی بڑھ سکتی ہے۔

اگرچہ ہر فرد و قوم کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم پیشین میں یہ قطعی معلومات موجود ہیں کہ فلاں شخص اور فلاں گروہ خدا کی طرف سے دی گئی زیادہ سے زیادہ مہلت کی آخری حد تک جائے گا یا نہیں، اور کون اپنی اہل مسمیٰ کو اپنے اعمال کی وجہ سے قریب لے آئے گا، اور کون اسے آگے دُور تک بڑھوائے گا، لیکن افراد و اقوام کو دئیے جانے والے نتائج اللہ اپنے علم پیشین کے بل پر نہیں دیتا، بلکہ ان کے اعمال نیک و بد کے صدور کے بعد دیتا ہے۔

(۱۳) اس سلسلے میں توضیح کے لیے اگر قوم یونس کی مثال کو سامنے رکھا جائے تو خاصی روشنی مل سکتی ہے۔ اس قوم میں ایک مرحلے پر بگاڑ اس حد تک آپہنچا تھا کہ خدا کی ناراضگی حضرت یونس کے قلب پر واضح ہو گئی تھی، اور انہوں نے نگاہِ نبوت سے دیکھ لیا تھا کہ ان کی قوم پر عذاب کی تموار بالکل ٹھک گئی ہے۔ چنانچہ وہ مُعذَّب ہونے والی قوم کو باقاعدہ اذنِ الہی سے پہلے ہی چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہیں گے کہ قوم یونس اس وقت اپنی اہل مسمیٰ کو بالکل قریب لے آئی تھی۔ لیکن قرآن نے اس قوم کی یہ واحد مثال ہمارے سامنے رکھی ہے کہ ایسی شدید بد اعمالیوں میں مبتلا ہونے کے بعد جو عذاب کو دعوت دینے والی تھیں، یکایک وہ اپنی گمراہی اور پستی کا احساس کر لیتی ہے اور خدا کے آنے والے عذاب سے خوفزدہ ہو کر آخری مرحلے میں توبہ و انابت کی راہ اختیار کر لیتی ہے جس کی توقع حضرت یونس کو نہ تھی۔ اس توبہ و انابت کے ذریعے قوم یونس نے ہاتھ سے جاتی ہوئی مہلتِ کار کو دوبارہ حاصل کر لیا، اور اس کی اہل مسمیٰ کا سنگِ میل یک دم دُور ہٹا کر فاصلہ بڑھا دیا گیا۔

اسی طرح قوم یہود کے احوال کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر اس طرزِ معاملہ پر غور کیا جائے جو مختلف مراحل میں خدانے ان سے روارکھا تو عرض کر وہ حقیقت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ان کی طرف سے دو بڑے ادوارِ فساد کے ظہور کا ذکر ہے، جن کے متعلق انہیں وارننگ دی جاتی ہے۔ مگر یہ قوم دونوں دفعہ وجہ فسادی بنتی ہے اور دونوں دفعہ ایسی کڑی سزا پاتی ہے کہ بظاہر دوبارہ سراٹھانا ممکن نہیں

نظر آتا۔ لیکن چونکہ مار کھانے کے بعد اس میں پھر رجوع الی اللہ پیدا ہوتا ہے، اس لیے اسے پھر خدا کی طرف سے مدد دے کر از سر نو مہلت کا ردی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں آتا ہے وَإِنْ تَعُوذُوا لَنَعُدَّ دَاوْرًا كَرِيمًا پھر ایسا ہی کرو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے۔

(۴)، ایک نہایت قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اپنے قرآنی پیغام ہدایت میں خدا تعالیٰ نے انسان کو ایک آزاد ذی شعور مخلوق کی حیثیت سے اپنے دین کے کام میں حصہ لینے کے لیے پکارا ہے۔ مثلاً یہ ارشاد کہ كُونُوا اَنْصَادًا لِلّٰهِ (اللہ کے مددگار بنو)۔ یا یہ اندازِ کلام کہ اَقْوِمُوا لِلّٰهِ قُرْءَانًا حَسَنًا (اللہ کو قرآنِ حسن دو)۔ یا یہ کہ كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ (انصاف کی علمبرداری کے لیے کھڑے ہونے والے بنو)۔

ظاہریات ہے کہ اگر انسان کو دینی اور اخلاقی مسلک پر چلانے کے لیے جبریت کا طریقہ کار فرما ہوتا تو اسے پکارنے اور اس میں رضا کارانہ جذبہ یا آزاد ارادہ ابھارنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

(۵)، جبر و اختیار سے مرکب زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک مثال مدد دے سکتی ہے۔ ایک شخص کی ملکیت میں ایک موٹر گاڑی بھی ہے اور اس کی غلامی یا ملازمت میں ایک ڈرائیور بھی ہے۔ اب مکمل جبریت کا وہ مقام بالکل الگ سمجھ میں آ سکتا ہے جو موٹر گاڑی کا ہے۔ موٹر گاڑی کے پُرزے اس طرح جوڑ دیئے گئے ہیں کہ وہ کسی صاحبِ دماغ ڈرائیور کے ہاتھوں مقررہ طریقے کے ساتھ چل سکتی ہے اور رک سکتی ہے۔ مگر موٹر کار کے ساتھ دماغ اور ارادہ موجود نہیں۔ وہ نہ بطورِ خود سمجھ سوجتی ہے، نہ دو راستوں میں سے کسی کا انتخاب کرتی ہے، اور نہ اس سے کسی غلطی یا گناہ یا خلاف ورزی قانون کا صدور ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے ڈرائیور اگرچہ غلامی یا ملازمت کے بندھن میں بندھا ہوا ہے، وہ کفالت یا تنخواہ یا اجرت کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، اسے مختلف راستوں اور ٹرکوں میں سے منزلِ مقصود کی طرف جانے کے لیے جگہ جگہ کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے اور وہ حسبِ ضرورت موڑ کاٹتا ہے۔ اُسے ٹرک پر نصب شدہ نشانات اور متباہی اشارات کا بھی لحاظ رکھنا ہوتا ہے۔ وہ گاڑی چلانے میں مالک کی مرضی کے خلاف غفلت سے بھی اور دانستہ بغاوت و انحراف کے جذبے سے بھی، اور اپنے کسی محدود وقتی فائدے کی ہوس میں اگر بھی غلط طریق پر سوچ سکتا ہے، غلط ارادہ کر سکتا ہے، اور غلط رخ پر یا غلط طریق سے گاڑی چلا کر یا تو کسی حادثے سے دوچار ہو سکتا ہے یا مالک کی ناراضگی مول لے سکتا ہے کیونکہ موٹر گاڑی کے بخلاف اسے دماغ اور قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ حاصل ہے، اس کے ساتھ جذبات اور خواہشات موجود ہیں، اور وہ سمع و بصر سے آراستہ ہے۔

موٹر گاڑی، انجنیئر یا مالک کی مرضی پر بنے ہوئے نقشے سے انحراف نہیں کر سکتی۔ ڈرائیور اپنی مرضی ہی سے چاہے تو مالک کے احکام کی پابندی کرے، اور اس روٹیے کا اچھا نتیجہ حاصل کرے، اور چاہے تو وہ ان احکام کی تعمیل میں گڑبڑ کرے یا مکمل بغاوت کا رویہ اختیار کرے، اور پھر اس روٹیے کا بڑا خمیازہ بھگتے۔

مشکلہ جبر و قدر میں الجھنے والے حضرات بالعموم انسان کو موٹر گاڑی کی سی پوزیشن دیتے ہیں جوئی الحقیقت خدانے طبعی نظام میں کسی ہوئی کائنات کو دی ہے۔ حالانکہ وہ ایک پرورش کنندہ مالک کی غلامی میں کام کرنے والے ذی شعور و ذی ارادہ ڈرائیور کی حیثیت رکھتا ہے۔

مالک اپنے ڈرائیور کو ہدایات دیتا ہے، اسے پروگرام بتاتا ہے، اسے جادہ سفر تجویز کر کے بتا دیتا ہے کہ فلاں سمت میں جانا ہے اور فلاں دور ہے پر یا چوراہے پر فلاں جانب مڑنا ہے اور فلاں فلاں اطراف میں بڑھنے سے اجتناب کرنا ہے۔ ایسی ہدایات موٹر کار کو نہیں دی جاتیں۔ وہ تو بے بس آلہ کار ہے۔ انسان ایسا سو فیصدی بے بس آلہ کار نہیں ہے۔

(۶) تاریخ میں بے شمار واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جنہیں تاریخ کے "اگر مگر" IFS AND

BUTS OF HISTORY سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی اگر فلاں معاملے میں فلاں صورتِ حالات نہ پیدا ہو جاتی تو

نتیجہ ورنہ نکلتا جو نکلا۔

کسان فصل بوتا ہے، اسے پروان پڑھانے کے لیے دن رات محنت کرتا ہے۔ مگر بارش وقت پر نہیں ہوتی، اولے برس جاتے ہیں، گرم زہریلی ہوا چل جاتی ہے، فصل تباہ ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف کسی اور موقع پر کسان نے سرسری کام کیا ہے مگر موسمی حالات کی سازگاری نے بہت اچھا نتیجہ پیدا کر دیا۔

جنگِ خندق کے موقع پر ایسی شدید آندھی چلتی ہے کہ مدینہ پر حملہ آور ہونے والے لشکرِ جرار کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور سارے عرب سے جمع شدہ یہ قوت مقصد حاصل کیے بغیر کھڑک واپس چلی جاتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ افراد کی زندگی میں بھی اور اقوام اور سرکویوں کی زندگی میں بھی انسانی سعی و جہد پر بہت بڑا اثر ایسے احوال و ظروف ڈالتے ہیں جن کے کسی خاص وقت پر پیدا کرنے میں انسان کا اپنا دخل یا تو بالکل نہیں ہوتا، یا نہایت ہی برائے نام اور غیر مؤثر ہوتا ہے۔ یہ احوال و ظروف مشیتی نظام سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی شخص یا قوم کو کیا قدرتی وسائل ملے؟ کیسی ذہنی و جسمانی صلاحیت کار ملی؟ کب کدھر سے کونسی دشمن یا دوست قوتیں ابھر آئیں؟

کب کس سے تصادم پیش آیا؟ اس تصادم میں قدرتی اور مین الاقوامی احوال کس طرح اثر انداز ہوئے؟ اقتصادی ترقی کے لیے کبھی یکا یک نئے معدنی، کیمیائی یا سائنسی تحقیق کے ذریعے کشف ہونے والے وسائل ہاتھ آجاتے ہیں۔ کبھی تجارتی عروج کے لیے بین الاقوامی منڈیوں میں کوئی سازگار صورت نمودار ہو جاتی ہے۔ کبھی معاملہ اس کے برعکس پیش آتا ہے۔ یہی حالات سیاسی اقتدار کے ادھر سے ادھر منتقل ہونے میں دیکھے جاتے ہیں۔

قرآن میں جا بجا امت محمدیہ (سلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی اور سابق انبیاء کی قوموں سے بھی ایسے وعدے کیے گئے ہیں کہ اگر تم راست روی اختیار کرو تو آسمان سے تم پر بارانِ رحمت برسے گی۔ یا یہ کہ خدا اولاد و اموال میں اضافہ کر کے تمہاری قوت بڑھائے گا۔

ایسے وعدوں کا تعلق اسی مثبتی نظام سے ہے جو موسیٰ اور طبعی دائرے سے لے کر تاریخی اور تمدنی دائرے تک نئے نئے احوال و ظروف کو ظہور دیتا ہے۔ جب خدا چاہتا ہے تو کسی فرد یا قوم کے لیے احوال و ظروف زیادہ سازگار ہو جاتے ہیں اور جب وہ چاہتا ہے تو ان کی ناسازگاری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اس جبریت سے انسان کے محدود اختیارات اور اس کی اخلاقی ذمہ داری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو مختلف حالات (SITUATIONS) سے گزار کر ان کی آزمائش کرتا ہے کہ وہ سازگار حالات میں کیا روش اختیار کرتے ہیں؟ اور ناسازگار حالات میں وہ خدا پرستی اور نیکی کی راہ پر قائم رہنے کے لیے کہاں تک زور لگاتے ہیں؟ دونوں صورتوں میں ان کی سوچ بچار کیسے کام کرتی ہے؟ وہ قوتِ فیصلہ سے کس طرح کام لیتے اور کیا ارادے باندھتے ہیں؟ اور پھر ان کو جائزہ عمل پہنچانے کے لیے عملی ذمہ داریاں کہاں تک انجام دیتے ہیں؟

بدلتے ہوئے احوال و ظروف، خصوصی واقعات، اتفاقی حوادث کو انسانی زندگی میں جو وسیع دخل حاصل ہے، اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے خدا پرست افراد و اقوام خدا کی رضا طلبی کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس سے مدد کی دعائیں کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے مثبتی نظام میں تصرفات فرما کر طرح طرح کے کرشمے دکھاتا ہے۔

البتہ احوال و ظروف کی سانگاری اور ناسازگاری، اور حالات کی نت نئی مفید اور مضر گروٹوں کے بارے میں ہم تفصیل سے یہ نہیں جان سکتے کہ مصلحت الہی کیا ہے؟ کیونکہ اس کے سامنے بے شمار مخلوق، بے شمار انسانی افراد، اور بے شمار انسانی گروہوں کے بے حد وسیع معاملات ہوتے ہیں، درآخرا لیکہ ہماری

فکر محض ایک محدود دائرے میں لگا ہوا ہے، مرکزِ ذکر کے کام کرتی ہے۔

۲) مستفسر صاحب کے خط میں سوالات کا ایک تجزیہ بھی تھا جس کا جواب پہلے لکھا نہیں جاسکا کہ کیا صحیح ہے کہ جو بچہ کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہوتا ہے وہ مسلمان ہوتا ہے اور چونکہ کسی دوسرے مذہب والوں یا محدود یا اشتراکیوں کے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے خاندان ہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں؟ یہ بات تو خود حدیث ہی میں مذکور ہے کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام لے کر پیدا ہوتا ہے (یعنی اس میں ایسے داعیات و رجحانات کارفرما ہوتے ہیں کہ اگر ان کو کام کرنے کا موقع ملے تو وہ تلاشِ حق کا سفر طے کر کے اسلام تک جا پہنچے گا)۔ مگر اس کے خاندان والے اسے یہودیت یا عیسائیت کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ بلکہ مشتزاد یہ کہ وہ اسے تلاشِ حق اور جستجوئے صداقت کے جذبہِ عالی سے محروم کر کے تعصبات کے بندھنوں میں جکڑ دیتے ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ جب یہ صورت ہے تو پھر غیر مسلم خاندانوں میں پلنے والے بچوں کا کیا قصور؟ بات بڑی زور دار ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ایک اہم حقیقت یہ بھی پیش نظر رہے کہ ہر انسان کے ذہن میں سوال اٹھانے کی قوت رکھی گئی ہے، اور ہر آدمی بلوغ کو پہنچ کر جب عقل سے کام لینے کے قابل ہو جاتا ہے تو طرح طرح کے سوالات نہباتی میں، گفتگوؤں میں، مطالعہ کرتے ہوئے اس کے دل میں اُبھرتے ہیں۔ اس کا ضمیر اس سے ضرور پوچھتا ہے کہ تم جو زندگی بسر کر رہے ہو کیا اس پر مطمئن ہو کہ یہ ٹھیک ہے؟ تم نے جس مذہب یا توحید کو اپنے خاندان یا اپنی قوم سے لیا ہے کیا وہ پورے کا پورا برحق ہے اور تمہارے لیے اور انسانیت کے لیے باعثِ فلاح؟ اور اس کے برحق ہونے کے کیا شواہد تمہارے پاس ہیں؟ اس کے علاوہ جو عقیدے، نظریے، مذاہب اور تہذیبی نظام پائے جاتے ہیں کیا تم نے ان کا جائزہ لے کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ تمہارے اختیار کردہ راستے سے زیادہ بہتر کوئی دوسرا راستہ ہو؟

عام لوگ ان چھیٹے ہوئے سوالوں کو، جن کے جواب تک پہنچنے کے لیے محنت درکار ہوتی ہے، نذرِ تغافل کر دیتے ہیں اور ان کو ذہن سے نوچ کر لاشعور میں دھکیل دیتے ہیں۔ پھر اطمینان سے بنے بنائے نقشہ زندگی میں لگن ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے مسلکِ آباد پرستی اختیار کیا کہ ہمارے آباؤ اجداد اور بزرگانِ سلف نے جو کچھ صحیح سمجھا وہ طے کر دیا۔ اب نہ کسی الہامی سند کی ضرورت، نہ کسی عقلی کاوش کی لیکن یہ سوالات آدمی کو مرتے دم تک چھوڑتے نہیں۔ وہ بار بار لاشعور کے بل سے نکل کر اس کے قلب و دماغ کو دہکتے

ہیں۔ اور تغافل و تساہل کے مریض انہیں بار بار نوچ کے پھینکتے رہتے ہیں۔ آخرت کی جوابدہی انہی سوالات کی بنا پر ہوگی کہ تمہارے دل میں ہماری دی ہوئی فطرت نے جو سوالات مسلک زندگی کی صحت و نادرستی کو جانچنے کے لیے بار بار اُبھارے تھے ان کا جواب معلوم کرنے کے لیے تم نے کیا کیا؟

دوسری طرف آپ کو ایسی ہستیاں ملتی ہیں کہ جنہیں ایک خاص طرز کا غلط ماحول پروان چڑھاتا ہے اور وہ ان کو اپنے رنگ میں رنگنے کے تمام وہ مروج اسلوب کام میں لاتا ہے جو بے شمار افراد پر کامیاب رہتے ہیں لیکن یہ ہستیاں ماحول کے اس جبری سانچے کے خلاف لڑنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں جس میں انہیں بچپن سے ڈھالنے کی ہر ممکن تدبیر کی جا چکی ہوتی ہے۔ آخر حضرت موسیٰ کس ماحول سے اُبھرتے ہیں؟ حضرت ابراہیمؑ کس خاندان میں آنکھ کھولتے ہیں؟ نبی آخر الزمانؐ کسی قوم کے نظام تربیت کے زیر سایہ آنکھ کھولتے ہیں؟ جدید دور کی عام ذہنی نوعیت کی مثالیں لیجیے۔ وہ لوگ کیسے اُبھرے جنہوں نے جبری بادشاہوں کے سامنے میں پل پوس کر برطانیہ، فرانس اور امریکہ میں جمہوریت کا علم بلند کیا؟ زار روس کے استبداد کے شکنجے میں کسی ہوتی قوم کے اندر سے باغیانہ رجحان نمودار ہوا۔ سرمایہ دارانہ معاشرے میں نشوونما پانے والے کامل مارکس نے آئینہ نظریہ پر مبنی پروتاری انقلاب کے خطوط تجویز کیے خود ہمارے برصغیر میں انگریزی استبداد کے اندر رہنے والی آبادی میں آزادی کی تحریک برپا کرنے والے مسلم اور ہندو لیڈر اُبھرے۔ اسی طرح ہندو اکثریت کے مسلم دشمن سامراجی غزائم کے بے نقاب ہو جانے پر اقبال نے فکری محاذ پر اور قائد اعظم نے آئینی سیاست کے محاذ پر ماحول سے جنگ آزمائی کی۔ اور ساری تاریخ کی رونق ایسی ہی ہستیوں سے ہے جنہوں نے بچپن سے ایک خاص طرح کی تربیت دینے والے ماحول کے دھارے کے خلاف پیرنے کی جرات کی۔

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہے کہ انسان میں قدرت نے ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں اور ایسے محرکات و دلیعت کیے ہیں کہ وہ خوفناک ترین ماحول کے پیچھے سے — خواہ وہ خاندانی ہو، یا سماجی یا سیاسی و اقتصادی — لڑ سکتا ہے۔ وہ اس کے خلاف باغیانہ طرز پر سوچ سکتا ہے۔ وہ ایسی تربیت اور ایسی تعلیم کے خلاف بھی ناقدانہ اور باغیانہ طرز فکر کو کام میں لا سکتا ہے جس کے ذریعے اس کے ذہن دکڑا کر دیا کو ایک خاص شکل دینے کی کوشش مسلسل کئی برس تک کی گئی ہو!

آخر مشرکین مکہ کے مٹ پرست معاشرے میں وہ چند نفوس بھی تو پوری طرح نمایاں ہیں جو حضور

خاتم النبیین کی بعثت سے قبل شرک اور مشرکانہ رسوم سے بیزار ہو کر سچی براہیمیت کا راستہ تلاش کرنے کے لیے مضطرب رہے اور بعض نے بڑی بھاری جدوجہد کی؟

اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی غلط ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اس کی غلطیوں اور خرابیوں کا شعور حاصل کر سکتا ہے، اس سے بیزار ہو کر صحیح راستے کی جستجو میں پڑ سکتا ہے، اور اگر اسے کوئی صحیح یا بہتر راستہ مل جاتے تو وہ ماحول سے لڑ سکتا ہے۔ وہ عام لوگ جو داخلی محرکات کے موجود ہونے کے باوجود یہ پارٹ ادا نہیں کرتے وہ دراصل تساہل و تغافل کا شکار ہوتے ہیں۔ اور زندگی کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے مسئلے میں تساہل و تغافل کا رویہ خدا کے ہاں جرم ہے۔ زندگی کا اصلاح و فساد اتنا چھوٹا مسئلہ نہیں کہ اس کی پروا نہ کرنے والے انسانوں سے کوئی تعرض نہ ہو۔

یہ الگ بات ہے کہ کسی کو سعی تلاش حق کی راہ پر گامزن ہوتے ہوئے اگر فی الحقیقت لایحل ذہنی یا خارجی موانع پیش آئیں تو خدا کی عدالت ان کی رعایت دے دے مگر جذبہ تلاش حق سے کام لے کر امکانی حد تک سعی کرنے کا مکمل فقدان لازماً ایک جرم ہے۔

اب رہا ہم مسلمانوں کا معاملہ، سو ہمارے ہاں کمی یہ ہے کہ اسلام کو شعوری طور پر پیش کرنے اور عمل سے اس کی صداقت کی گواہی دینے کے لیے نظام ریاست کے پیلنے پر کوئی جامع اور ہمہ گیر تحریک مذہبوں کا فرما نہیں ہے۔ حالات نے جس حد تک گنجائش دی، افراد اور اداروں نے محدود صورت میں حق کی گواہی دینے اور اسلام کی دعوت کا علم بلند کرنے کا کام ضرور کیا۔ لیکن زندگی کے تمام شعبوں، تمام ممالک اور تمام طبقوں اور عرصوں میں اسلام کا تحریکی عمل تسلسل سے جاری نہیں رہ سکا۔ بخلاف اس کے بہت سی مخالفتیں اور تحریکیں کار فرما ہوتی رہیں جن میں نیشنلزم اور سیکولرزم سے لے کر سوشلزم اور کمیونزم تک سبھی کو شمار کرنا چاہیے۔

اسلامی تحریک اگر کام کر رہی ہوتی تو وہ اسی طرح مسلم اور غیر مسلم حلقوں سے اپنے لیے ایمان و شعور رکھنے والے کارکن حاصل کرتی، جیسے وطنیت اور نسلی قوم پرستی اور سیکولرزم اور سوشلزم کی تحریکیں آج ہم مسلمانوں کے گھرانوں میں سے اپنے لیے کارکن حاصل کر کے ان کو اسلام کے خلاف اور ہم مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتی ہیں۔

اسلامی تبلیغ کی متفرق کوششوں کے باوجود، اسلامی تحریک کے برسر عمل نہ ہونے کی وجہ سے اسلام صرف خاندانی راستے سے بطور ایک میراث کے ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہونے لگا۔ یہ بھی غنیمت ہوتی۔

مگر بدستی سے وہ پورا اسلام نہیں ہے جو خاندانوں کے ماحول سے مسلمانوں کو ملتا ہے بلکہ وہ محض ایک مذہباتی اور دینی وابستگی، ایک غیر شعوری ایمان اور زیادہ نہ ایک غیر عملی عصیت ہے جو خاندانی ماحول مسلمانوں کی اولادوں کو ملے رہا ہے۔ اسلام سے یہ کمزور قسم کی وابستگی اس مصیبت کا باعث بنی ہے کہ ہمارے ہاں فکر و عمل کے خوفناک نقصان پائے جاتے اور منافقت کی رنگا رنگ اقسام رائج ہو گئی ہیں۔

بہر حال یہ ذمہ داری تو ہم مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے کہ ہم اپنے خاندانوں کے ماحول سے ملنے والے اسلام کے بارے میں اپنے ضمیر سے اٹھنے والے سوالات کی روشنی میں یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ہمیں جو کچھ میراث میں ملا ہے وہ کیا ہے؟ اس کی ضرورت و اہمیت پر غور کریں؟ اس کے بارے میں یہ جانیں کہ اس کے ایمانی و شعوری سرچھے کیا ہیں اور ان کے ذریعے یہ معلوم کریں کہ اس دین یا نظام کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کے نقصان کیا ہیں؟ اور پھر سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں کہ آیا ہمیں صحیح اور مکمل اسلام کو لے کر چلنا ہے، یا اپنے ضمیروں سے اٹھنے والے سوالات کو کھیل کر اپنے آپ کو اسی بے معنی حالت میں مبتلا رکھنا ہے جس پر کسی نہ کسی حد تک اس ارشاد الہی کا اطلاق ہو سکتا ہے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَلَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ يَعْنِيْ نَهْ اِدْهَرَ كَهْ، نَهْ اِدْهَرَ كَهْ۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم کی اس کیفیت کی پوری ذمہ داری خاندان اور معاشرے کے ماحول پر نہیں ڈالی جاسکتی، بلکہ بلوغ کو پہنچنے والا ہر فرد اپنے ذہن کی اُن استغیامی تحریکات کی بنا پر جوابدہ ہے جو اس کے اندر سمندر کی موجوں کی طرح اٹھتی رہتی ہیں، اور جن سے وہ بڑی حد تک باخبر ہوتا ہے (علیٰ نقض بصیرۃ)

(۸) اوپر کے اشارات سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ خدا نے نظامِ مشیت اور نظامِ تکوینی کے لیے قوانین و نواہی کی جو مشینری بنا دی ہے، اسے چلا کر وہ بے تعلق ہو گیا ہے، اور اب کسی طرح کے تصرف و مداخلت کا صدور اس کی طرف سے نہیں ہوتا۔

چونکہ اس کائنات کے مشیتی و تکوینی نظام میں اس نے ارادہ، علم اور قوتِ فیصلہ رکھنے والی ایک مخلوق احسنِ تعویم پر پیدا کی ہے، اس لیے اس مخلوق کے رویوں کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ طبعی اور باطنی دونوں طرح کے احوال و ظروف میں بعض خاص تصرفات فرماتا ہے۔ وہ افراد اور اقوام کے لیے مختلف مراحل میں اور مختلف مواقع پر نقشہ حالات کی ترتیب کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ کبھی نصرت و تائید کے لیے کبھی سزا و تادیب کے لیے کبھی آزمائش کے لیے اور کبھی تربیت کے لیے وہ افراد و اقوام کو ان کے رویوں کے مطابق مختلف قسم کے احوال سے دوچار کرتا ہے جن میں بعض آہستہ آہستہ سلسلہ علت و معلول کے تحت رونما

ہوتے ہیں، اور بعض غیر متوقع اور نادیدہ صورتوں میں۔

افراد اور اقوام کے رویوں کی تبدیلی کے ساتھ تکوینی اور طبعی اور تاریخی احوال میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کا بڑا کائنات کے تکوینی و طبعی ضابطوں کے رُوسے آپس میں نہیں لگایا جاسکتا۔

یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر توبہ و انابت اور دعا و عبادت کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ مظاہر خدا پرستانہ رویے کی روح رواں ہیں۔ ہم دعا اسی شعور کے تحت مانگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے قائم کردہ تکوینی و مشیت نظام میں تصرف کے بالاتر اختیارات حاصل ہیں، وہ کسی دوسری طاقت کے بنائے ہوئے قوانین کا پابند نہیں ہے، بلکہ اپنے بنائے ہوئے قوانین پر چلنے والے نظام وجود کا فرماں روا ہے مطلق ہے۔

یہ سوال کہ جب قوانین بناؤ گے تو پھر تعریفِ خاص کے کیا معنی؟ اس کے جواب میں کچھ نکات کی روشنی میں یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جانی چاہیے کہ خود اس تعریفِ خاص کے لیے بھی خدا نے کچھ قوانین وضع کیے ہیں جو انسانوں کے اخلاقی رویوں اور تکوینی و تاریخی قوانین کے عمل میں ایک ایسا رابطہ پنہاں پیدا کرتے ہیں جسے خالص طبعی قوانین اور تاریخی ضابطوں کی بنا پر دریافت نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بالآخر حقیقت محض الہامی علم کے ذریعے واضح ہوتی ہے۔

(۹) آخر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ مجھے کوئی ایسا مسلمان نہیں ملا جو جبریتِ کاملہ کے غیر معتدل تصور کا کٹر سے کٹر علمبردار ہوتے ہوئے بھی، زندگی کے معاملات کو اس تصورِ جبریت کے مطابق چلائے یعنی اگر کھانے یا پہننے کو کچھ نہ ملے تو وہ کوئی تنگ و دوندہ کرے، اور بچہ بیمار پڑ جائے تو اس کے علاج کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مارے، یا کوئی درندہ اس پر چھپنے والا ہو تو بچاؤ کی تدبیر نہ کرے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس غیر اسلامی نظریہ جبریت کا عملی اطلاق صرف دینی و اخلاقی ذمہ داریوں کے دائرے ہی میں کیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جو رویہ ہم دائرہ معاش میں اختیار کرتے ہیں، وہی معاویہ کیوں اختیار نہیں کرتے؟ اور پھر اسی رویے کے مطابق جبر و قدر کا وہ صحیح و متوازن تصور کیوں نہیں اپناتے جو اسلام دے رہا ہے۔